مسلمان دنیا میں کہیں امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس تفسیر کی رُو سے تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ نہ صرف تمام غیر مسلم حکومتوں کے خلاف بلکہ ان مسلمان حکومتوں کے خلاف بھی عَلَمِ جہاد بلند کریں جن میں اسلامی حدود و قوانین نافذ نہیں ہیں۔ اور جب یہ ہمارا نظریہ اور یہ ہمارا دینی فریضہ ہو تو کس طرح ممکن ہے کہ غیر مسلم ہم کو اپنا پُرامن ہمسایہ سمجھ کر باطمینان ہمارے ساتھ معاملت کر سکیں اور غیر مسلم حکومتیں اپنے حدودِ عمل میں ہمارے وجود کو برداشت کر سکیں؟

ان دلائل میں سے پہلی دلیل دراصل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کسی شخص کا بجائے خود ایک عقیدے کو ماننا اور اپنی زندگی میں ایک خاص طریقہ کی پیروی کرنا، یہ اور چیز ہے اور اس کا اپنے نظریات کے مطابق اجتماعی زندگی کے لیے ایک نظام بنانا اور اس نظام کو بزور ایک ملک کے باشندوں پر جاری کر دینا بالکل ایک دوسری چیز۔ معترضین ان دونوں چیزوں کو ایک سمجھتے ہیں اور ان کے فرق کو نظر انداز کر کے لَآ اِکْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ وغیرہ آیات کو ان مجموعہ پر چسپاں کر دیتے ہیں، حالانکہ ان آیات کا تعلق صرف امرِ اول سے ہی ہے۔ بلاشبہ ہم کسی غیر مسلم کو مجبور نہ کریں گے کہ وہ اپنا عقیدہ چھوڑ کر اسلامی عقیدہ قبول کرے یا اپنی مذہبی عبادات کو ترک کر کے نماز روزہ کی پابندی اختیار کر لے۔ لیکن ہم اُس کا یہ حق کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ اخلاق، تعلیم، تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست وغیرہ اجتماعی امور کے متعلق اپنے نظریات کو حاکمانہ قوت کے ساتھ بجبر ہم پر مسلط کر دے۔ دوسروں کو ان کے مسلک پر چلنے دینا بے شک رواداری ہے، مگر یہ کوئی رواداری نہیں ہے کہ اپنے مسلک کے خلاف ہم اپنے اوپر دوسروں کے مسلک کا تسلط برداشت کریں، حتیٰ کہ اگر وہ زنا کو حلال سمجھتے ہوں اور لوگوں کو اس کی عام اجازت دیتے ہوں تو ان کی حکومت میں بے بس رعیت کی حیثیت سے رہتے ہوئے ہماری سوسائٹی میں زنا پھیلتی چلی جائے اور ہم اسے گوارا کریں، اگر وہ سود کو جائز سمجھتے ہوں اور خود ان کی حکومت سودی لین دین کرتی ہو تو ملک کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہمارا کوئی بڑے سے بڑا زاہد و متقی تک سود کے غبار سے نہ بچ سکے اور ہم ایک دیا سلائی اور روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ خرید سکیں جب تک کہ اس کی قیمت میں سے سود کا ایک حصہ بالواسطہ ٹیکسوں کی شکل میں ہماری جیب سے نہ نکل جائے، اگر وہ دہریت و الحاد کے نظریات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو ملک کی عمومی تعلیم کا پورا انتظام انہی نظریات اور اسی ذہنیت دراسی

ملحدانہ اخلاق پر تعمیر ہو جائے اور باشندگانِ ملک کے لیے ترقی و خوش حالی کے تمام دروازے اس جہنم کے دروازے کے سوا بند ہو جائیں اور ہمارا کوئی بڑے سے بڑا خدا پرست بھی اپنی نسل کو اس الحاد اور ملحدانہ اخلاق کے اثرات سے نہ بچا سکے، اگر وہ خدا کے قانون کو منسوخ کر کے خود قوانین بنائیں اور ملک کا نظام تمدن اُن قوانین پر قائم کریں تو ہماری معاشی و معاشرتی اور تمدنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مجبوراً اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور اُس قانون پر چلنے لگے جس پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔ کوئی ہمیں بتائے کہ آخر یہ رواداری کی کونسی قسم ہے اور لا اکراہ فی الدین کا یہ مطلب کس عقل کی رو سے صحیح ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے دین میں جو اکراہ ہو اُسے ہم برداشت کریں۔

یہ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کے نظم کو قائم کرنے کے لیے بہر حال ایک قوتِ قاہرہ کی ضرورت ہے جسے "اسٹیٹ" یا ریاست کہتے ہیں — اس ضرورت کا انکار انارکی پر اعتقاد رکھنے والوں کے سوا آج تک کسی نے نہیں کیا، یا پھر اشتراکی تصوف میں ایک ایسے مقام کا تصور کیا گیا ہے جہاں پہنچ کر انسان کی حیاتِ اجتماعی اسٹیٹ کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گی لیکن یہ صرف عالمِ خیال کی باتیں ہیں جن کی تائید میں کوئی تجربہ یا مشاہدہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ عملی زندگی کا تجربہ اور انسانی فطرت کا علم یہی بتاتا ہے کہ تمدن کا قیام ایک قوتِ قاہرہ کا یقیناً محتاج ہے — پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ قوت جو اپنے قہر و غلبہ سے نظامِ تمدن کو قائم رکھتی ہے بجائے خود کسی نہ کسی نظریے اور کسی نہ کسی اجتماعی مسلک کی قائل ہوتی ہے، اسی نظریہ و مسلک کے مطابق وہ اپنے لیے ایک لائحۂ عمل بناتی ہے، اسی لائحۂ عمل کو وہ قاہرانہ طاقت کے ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ کرتی ہے، اور تمدن کی شکل کے بننے اور بگڑنے میں اس قہر کی نوعیت اور اس لائحۂ عمل کی اصولی و تفصیلی صورت کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ صرف اجتماعی زندگی ہی نہیں، انفرادی زندگی بھی بڑی حد تک طوعاً و کرہاً اُس سانچے میں ڈھل کر رہتی ہے جسے اسٹیٹ اپنے قہر و تسلط سے بنا دیتا ہے۔ جو لوگ کسی اسٹیٹ کے دائرے میں رہتے ہوں وہ چاہے اس کے بنیادی نظریہ اور اس کے تفصیلی لائحۂ عمل پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور کسی طرح اس پر راضی نہ ہوں، لیکن انھیں چار و ناچار اپنے عقیدہ و مسلک کے ۹۰ فی صدی حصہ سے دست بردار ہو کر اسٹیٹ کے عقیدہ و مسلک پر

چلنا پڑتا ہے اور باقی دس فی صدی میں بھی ان کے عقیدہ و مسلک کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہوتی چلی جاتی ہے۔

اسٹیٹ کی اس نوعیت کو ملحوظ رکھنے اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ اجتماعی زندگی کے لیے اسٹیٹ بہرحال ہے ناگزیر، ایک صاحبِ فکر و نظر آدمی کے لیے اس حقیقت کا ادراک کچھ مشکل نہیں رہتا کہ جو گروہ آج کل کے محدود معنوں میں محض ایک "مذہب" کا معتقد نہ ہو بلکہ ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی یعنی "دین" پر اعتقاد رکھتا ہو وہ اگر اپنے اعتقاد میں سچا ہے اور اپنے اعتقاد کے خلاف زندگی گزارنا نہیں چاہتا تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ آگے بڑھ کر خود اس قوتِ قاہرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے جو نظمِ اجتماعی کی صورت گری کرتی ہے اور اپنے زور سے اس کو قائم رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریگا تو دوسرے اس قوت پر قبضہ کریں گے اور پھر یہ گروہ مجبور ہوگا کہ اجتماعی و انفرادی زندگی کے کم از کم ۹۰ فی صدی امور میں اپنے "دین" کے بجائے اُن کے "دین" پر چلے۔ متمدن زندگی میں "اکراہ" لامحالہ ہم سب سے کسی ایک کو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر ہم نہ کریں گے تو کفار کریں گے، لہٰذا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، بجائے اس کے کہ کفار اس دائرے میں ہم پر اکراہ کریں اور ہمیں جہنم کی طرف گھسیٹ کے لے جائیں یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم اُن پر اکراہ کریں اور انھیں اس مقام کے قریب لا کھڑا کریں جہاں اگر وہ چاہیں تو ان کو بآسانی جنت کا راستہ مل سکتا ہے۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے، اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زمین کا مالک اللہ ہے، اس کی زمین پر رہنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے، اور اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اُس کو پہنچتا ہے جو اس کا مطیع فرمان ہو اور اس کے قانونِ فطری و شرعی کا اتباع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ ظالم ہے، غاصب ہے، باغی ہے۔ اس کی یہ نافرمانی صرف خلافِ حق ہی نہیں بلکہ زمین کے انتظام میں فساد اور اہلِ زمین کے لیے فتنہ کی موجب بھی ہے۔ لہٰذا حق تو یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اُس کے قانونِ فطری و شرعی کی پیروی سے منحرف ہیں ان کو زمین میں جینے کا حق بھی نہیں ہے، لیکن یہ اللہ کی بہت بڑی عنایت اور اس کا انتہائی حلم ہے کہ وہ ان کو نہ صرف جینے کی مہلت دیتا ہے، بلکہ ان کو ان کے کفر، شرک، دہریت اور الحاد پر اس حد تک قائم رہنے کا اختیار بھی دیتا ہے جہاں تک ان کی بغاوت دوسرے بندگانِ خدا کے لیے فتنہ و فساد کی موجب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ اس بات کو ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ یہ لوگ اس کے قانونِ شرعی

کو منسوخ کر کے اپنے خود ساختہ قوانین پر اس کی زمین کا نظم و نسق چلائیں اور اس کی زمین کو فساد سے بھر دیں۔ اس لیے وہ اپنے قانونِ شرعی پر ایمان لانے والوں کو حکم دیتا ہے کہ کفار کو دینِ حق پر ایمان لانے کے لیے تو مجبور نہ کرو، لیکن غلبۂ کفر و کفار کے فتنہ کو پوری طاقت سے مٹانے کی کوشش کرو، یہاں تک کہ زمین کا انتظام عملاً میرے "دین" پر قائم ہو جائے اور جو میرے دین کو نہیں مانتے وہ "کابر" نہیں بلکہ "صاغر" بن کر رہیں۔

ان حقائق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد دوسری دلیل کا زور آپ سے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام فی الواقع خدا کے فرستادہ پیغمبر تھے تو پھر ان کی زندگی کا مشن بھی اس کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا جو ہر رسولِ برحق کا مشن رہا ہے، یعنی خدا کے دین کو ہر دوسرے دین پر غالب کر دینا۔ اس مقصدِ وحید سے ہٹ کر جن لوگوں کی رائے میں حضرت یوسف دین اللہ کے بجائے دین الملک پر زمین کا انتظام کر رہے تھے ان کی رائے اگر تسلیم کر لی جائے تو یوسفِ صدیق اور سر سکندر و فضل الحق میں کوئی اصولی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس معاملہ میں جو لوگ حقیقت سے دور چلے گئے ہیں انھوں نے دراصل قصۂ یوسف علیہ السلام کو نہیں سمجھا۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے وقت کے فرعون سے جو کہا تھا کہ اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ، تو یہ ان کی طرف سے محض ملازمت کی ایک درخواست تھی جو دربارِ شاہی میں قبول ہو گئی اور ان کو وہ منصب مل گیا جو اکبر کے ہاں ٹوڈرمل کا منصب تھا۔ حالانکہ وہاں صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے ابتداءً دینِ حق کی اقامت کے لیے وہی راستہ اختیار فرمایا تھا جو انبیاء علیہم السلام اختیار فرماتے رہے ہیں، یعنی دعوتِ عام، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کی تربیت و تنظیم، پھر انھیں ساتھ لے کر اقامتِ دین کے لیے مجاہدہ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس دعوت کا سلسلہ جیل ہی میں شروع کر دیا تھا جس کے مواعظ میں سے ایک بے نظیر وعظ سورۂ یوسف کے پانچویں رکوع میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن آگے چل کر ان کے سامنے یکایک ایک ایسا موقع آ گیا جس سے وہ اپنے مقصود تک مختصر راستہ سے پہنچ سکتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ عزیزِ مصر کی بیوی اور اس کی سہیلیوں کے معاملہ میں جس پاکیزہ اور مضبوط سیرت کا اظہار ان سے ہوا تھا

اور پھر تعبیرِ خواب کے معاملہ میں جس بصیرت کا ثبوت انھوں نے دیا تھا اس کی وجہ سے فرعون ان کا اس حد تک معتقد ہو چکا ہے کہ اگر وہ اس وقت حکمرانی کے کامل اختیارات اس سے طلب کریں تو وہ بلا تامل پیش کر دے گا۔ اس لیے انھوں نے تحریکِ عمومی کی راہ سے اپنا مشن پورا کرنے کے بجائے اقتدارِ حکومت پر فوراً قبضہ کر کے دینِ حق قائم کر دینے کو زیادہ قریب کا راستہ پایا اور فرعون سے مطالبہ کر دیا کہ اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ "زمینِ مصر کے تمام وسائل و ذرائع میرے اختیار میں دے۔" یہ محض وزیرِ مالیات کے منصب کا مطالبہ نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ڈکٹیٹرشپ کا مطالبہ تھا اور اس کے نتیجہ میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب قریب وہی پوزیشن تھی جو اس وقت اٹلی میں مسولینی کو حاصل ہے (اس فرق کے ساتھ کہ اٹلی کا بادشاہ مسولینی کا معتقد نہیں بلکہ محض اس کی پارٹی کے اثر سے مجبور رہے، اور وہاں بادشاہ خود حضرت یوسف کا مرید ہو چکا تھا)، حضرت یوسف کے اس اقتدار کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دیتا ہے کہ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ "اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا، وہ اس کے جس حصہ کو چاہتا اپنی جگہ بنا سکتا تھا" یعنی پورا ملک اس کے قابو میں تھا۔ پھر اس کی مزید شہادت سورۂ مائدہ میں ملتی ہے جہاں حضرت موسیٰ اپنی قوم سے فرماتے ہیں يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ "اے قوم! یاد کرو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا کہ تم میں انبیاء پیدا کیے تھے، تم کو حکمراں قوم بنایا تھا اور تمھیں وہ کچھ دیا تھا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کو مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا تھا اس کی وجہ سے وہاں آخر کار مکمل انقلاب رونما ہوا، فراعنہ کے بجائے بنی اسرائیل حکمراں ہوئے اور ان کو وہ عروج نصیب ہوا جو ان کی ہمسر قوموں میں کسی کو حاصل نہ تھا۔ پھر جو مذہبی اثر حضرت یوسف نے مصر میں چھوڑا اس کی شہادت سورۂ مومن سے ملتی ہے جس میں حضرت موسیٰ کے ہمعصر فرعون کو خطاب کر کے قبطی قوم کا ایک صاحبِ ایمان شخص کہتا ہے وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا "تمھارے پاس یوسف روشن نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر پہلے تو تم اس چیز کی طرف سے شک میں رہے جسے وہ لائے تھے اور جب وہ انتقال فرما گئے تو تم نے کہا اب اللہ کوئی رسول نہ بھیجے گا"

یعنی اس پایہ کا شخص اب نہیں آسکتا۔

حضرت یوسفؑ کے معاملہ کی یہ حقیقت جاننے کے بعد کون اس سے یہ استدلال کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ غیر اسلامی نظامِ حکومت کا پرزہ بننا برحق ہے کیونکہ ایک نبی برحق ایسا کرچکا ہے۔ رہی آیت مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ جس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعونی قوانین کی پابندی کرتے تھے، تو اگرچہ اس آیت کے معنی و مفہوم میں بہت کچھ کلام کی گنجائش ہے لیکن اس کا جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے اگر اسی کو تسلیم کرلیا جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ اس سے ثابت ہوتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ حضرت یوسفؑ کے دورِ حکومت میں جس موقعہ پر یہ معاملہ پیش آیا (اور قرائن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور ہی کا واقعہ تھا کیونکہ آنجناب کے عزیز مصر ہونے کے چند ہی سال بعد وہ مشہور ہفت سالہ قحط شروع ہوا جس میں آپ کے بھائیوں کو غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر آنا پڑا تھا) اس وقت تک مصر میں فوجداری قانون وہی رائج تھا جو پہلے سے چلا آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک ملک کے نظامِ تمدن کو آنِ واحد میں نہیں بدلا جاسکتا۔ یہ کام بہرحال تدریج ہی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی عرب کے نظامِ تمدن کو بدلتے بدلتے دس سال لگ گئے تھے۔ وراثت کا قانون سنہ ۳ یا سنہ ۴ ہجری میں بدلا گیا، نکاح و طلاق کے قوانین ہجرت کے بعد پانچ چھ سال میں مکمل طور پر نافذ کیے گئے، فوجداری قوانین کی تکمیل میں پورے آٹھ سال لگ گئے، ملک کا معاشی نظام بتدریج ۹ سال میں بدلا گیا، شراب کا قطعی انسداد ۸ھ میں ہوا اور سود کی کلی ممانعت ۹ھ میں کی گئی۔ اسی طرح اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ملک کے قوانین بدلنے میں تدریج سے کام لیا ہو اور ایک خاص وقت تک ان کے زمانۂ حکومت میں سابق قوانین جاری رہے ہوں تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ایک پیغمبر خدا کے سوا دوسروں کے جاہلی قوانین کو جائز سمجھ کر ان کی پابندی کرتا تھا؟

رہی تیسری دلیل تو اسے دراصل دلیل کے بجائے عذر کہنا چاہیے۔ اس عذر کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں اور یہاں صرف ایک حدیث سنانے پر اکتفا کرتے ہیں جسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ

والجهاد ماض منذ بعثني الله الى ان يقاتل آخر هذه الامة الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل	اور جہاد میری بعثت کے وقت سے اس وقت تک جاری رہنا ہے جبکہ میں امت کا آخری گروہ دجال سے جنگ کریگا۔ نہ کسی ظالم کا ظلم اسے باطل

کرسکتا ہے اور نہ کسی عادل کا عدل (یعنی نہ اسے اس عذر کی بنا پر روکا جاسکتا ہے کہ اس وقت بڑے جابر ہم پر مسلط ہیں، نہ اس بات کو بہانہ بنایا جاسکتا ہے کہ حکومت اگرچہ کفار کی ہے مگر ہم کو امن نصیب ہے اور ہمارے ساتھ انصاف ہو رہا ہے، اور نہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ اگر ان کے اپنے ملک میں عدل کا دور دورہ ہو تو وہ مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں اور باہر کی دنیا میں جو ظلم و فساد برپا ہو اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں)

تفہیم القرآن

(٦)

آل عمران

(از رکوع ۱ تا رکوع ۹)

اس سورۃ میں ایک مقام پر "آل عمران" کا ذکر آیا ہے۔ اسی کو علامت کے طور پر اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے۔

اس میں چار تقریریں شامل ہیں۔ پہلی تقریر آغاز سورۃ سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیتوں تک ہے اور وہ غالباً جنگ بدر کے بعد قریبی زمانہ ہی میں نازل ہوئی ہے۔ دوسری تقریر آیت اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (اللہ نے آدم اور نوح اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے کام کے لیے منتخب کیا تھا) سے لے کر چھٹے رکوع کے اختتام تک ۹ھ میں وفد نجران کے موقع پر نازل ہوئی۔ تیسری تقریر ساتویں رکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے اور اس کا زمانہ پہلی تقریر سے متصل ہی معلوم ہوتا ہے۔ چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختم سورۃ تک جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ ان مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے وہ مقصد و مدعا اور مرکزی مضمون کی یکسانیت ہے۔ سورۃ کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے، ایک اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ)، دوسرے وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ پہلے گروہ کو اسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورۃ بقرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ ان کی اعتقادی